(قسط نمبر ۲)

# میرا سفرِ حجاز

## مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی

حضرت مولانا رحمت اللہ نے فتنۂ مسیحیت کے استیصال کی غرض سے جو کتابیں ردِّ نصاریٰ میں تالیف کیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اظہار الحق، خلیفۃ المسلمین سلطان عبد العزیز خاں اور صدر اعظم خیر الدین پاشا تونسی کی تحریک پر پادری فنڈر سے اکبر آباد آگرہ میں جو مناظرہ ہوا۔ اس کی مفصل کیفیت اور تمام مسائل کا نہایت بسط و شرح کے ساتھ اس کتاب میں بیان ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ ۱۶ رجب ۱۲۸۰ھ میں قسطنطنیہ میں اس کتاب کی تالیف شروع کی اور آخر ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ میں ختم ہوئی۔ ۱۲۸۱ھ میں سب سے پہلے قسطنطنیہ میں چھپی۔ صدر اعظم موصوف کے حکم سے ایک ترک عالم نے اس کا عربی سے ترکی میں ترجمہ کیا۔ اور "ابزار الحق" کے نام سے مکمل ترکی ترجمہ شائع ہوا۔ نیز یورپ کی متعدد زبانوں میں حکومت کی طرف سے اس کے ترجمے شائع کیے گیے جن کو پادریوں نے خاص اہتمام اور کوشش سے تلف کیا۔ مصر میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے[۱] مولوی سلیم اللہ صاحب مرحوم نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا تھا جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ مولوی غلام محمد صاحب بھانجا اندیری نے بڑی محنت و جانکاہی سے گجراتی سے ترجمہ کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ اظہار الحق کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کے بعد "ٹائمز آف لندن" نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

---

[۱] اس احقر کی ذاتی لائبریری میں اس کتاب کا مصری ایڈیشن موجود ہے۔

"لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی"

۲۔ ازالۃ الاوہام ـــــ یہ کتاب ۵۶۴ صفحات پر سید المطابع کوچہ بلاقی بیگم دہلی میں سید قوام الدین صاحب کے زیر اہتمام فارسی میں ۱۲۶۹ھ میں بڑی تقطیع پر چھپی۔ رد نصاریٰ کے اکثر مباحث کا اس میں مسکت جواب ہے اس میں پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" کے اعتراضات کے دنداں شکن جوابات بھی ہیں۔

۳۔ ازالۃ الشکوک ـــــ یہ کتاب عیسائیوں کے انتالیس سوالوں کا جواب ہے۔ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں تصنیف ہوئی اور دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

۴۔ اعجاز عیسوی ـــــ اس کتاب میں پوری طرح بائیبل کا غیر معتبر اور محرف ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں آگرہ میں لکھی گئی۔ پہلی بار آگرہ میں اور دوسری مرتبہ مطبع رضوی دہلی میں طبع ہوئی۔ دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

۵۔ احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث ـــــ دلائل عقلیہ و نقلیہ سے تثلیث کا ابطال کیا گیا ہے۔ ۱۲۷۱ھ میں تصنیف ہوئی اور مطبع رضوی دہلی میں ۱۲۹۲ء میں چھپی۔

۶۔ بروق لامعہ ـــــ رسول مقبول ﷺ کی شان رسالت کا مدلل اثبات اور خاتم المرسلین پر ختم رسالت کو ثابت کیا گیا ہے۔ غیر مطبوعہ۔

۷۔ البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف ـــــ ۱۲۷۰ھ میں لکھی گئی۔ ۵۶ صفحات پر فخر المطابع دہلی میں چھپی ہے۔

۸۔ معدل اعوجاج المیزان ـــــ یہ کتاب میزان الحق مؤلفہ پادری فنڈر کا جواب ہے۔

۹۔ تقلیب المطاعن ـــــ یہ کتاب "تحقیق دین حق" مؤلفہ پادری لاسمند کا رد اور جواب ہے۔ غیر مطبوعہ۔

۱۰۔ معیار التحقیق ـــــ کتاب "تحقیق الایمان" مؤلفہ پادری صفدر علی کا دنداں شکن جواب ہے۔[1]

**انقلاب ۱۸۵۷ء اور مولانا رحمت اللہ**

پرگنہ کیرانہ و شاملی میں شیوخ اور مسلمان گوجروں کے ہاتھ میں زمینداری تھی جن میں دین داری کے ساتھ جوش بھی تھا۔

---

[1] مرد مجاہد ص ۲۰۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون اور کیرانہ کا ایک محاذ قائم کیا گیا۔ تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور مولوی عبدالحکیم صاحب تھانوی معہ رفقاء کے اور نواحی کیرانہ میں مولانا رحمت اللہ نے گورہ فوج کا مقابلہ کیا۔

عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم و تربیت کے لیے کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا اور اعلان ہوتا تھا "ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا"۔ اس جملہ کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا تھا، وہ عوام کو سنایا جاتا تھا۔

اس محاذ پر بظاہر شکست کا امکان نہ تھا مگر بعض ابنائے وطن کی زمانہ سازی اور مخبروں کی سازش نے حالات کا رُخ بدل دیا۔ کیرانہ میں گورہ فوج اور توپ خانہ داخل ہوا۔ مولانا رحمت اللہ کی تلاشی ہوئی۔ لیکن مولانا موقع پاتے ہی نکل گئے۔ آپ کو باغی قرار دے کر گرفتاری کے لیے انعام کا بھی اعلان ہوا۔ حضرت مولانا مرحوم اپنا نام "مصلح الدین" بدل کر پیدل دہلی روانہ ہوئے۔ دجے پور اور جودھ پور کے مہیب ریگستانوں کو پاپیادہ طے کرتے ہوئے سورت پہنچے، اس زمانہ میں بندرگاہ سورت سے جہاز کا سفر آسان نہ تھا۔ بادبانی جہاز چلا کرتے تھے۔ سال بھر میں صرف ایک جہاز ہوا کا رُخ موافق پاکر سورت سے روانہ ہوتا اور اس طرح جدہ سے آیا کرتا تھا۔ مولانا اس بادبانی جہاز کے ذریعہ جدہ روانہ ہوئے۔ طویل سفر کے بعد بالآخر مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، مولانا کیرانوی سے کچھ پہلے مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے اور رباط داود یہ (جو باب العمرہ سے متصل ہے) کے ایک حجرہ میں مقیم تھے۔ صبح صادق کے قریب حضرت مولانا مرحوم مکہ معظمہ پہنچے۔ مطاف میں حضرت حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد دونوں رباط داود یہ میں آئے۔

مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے قیام مکہ کے دوران وہاں کے درس و تدریس کے نظام کو ناقص سمجھا اگرچہ سلطنت عثمانیہ کی طرف سے لاکھوں روپیہ تعلیم پر خرچ ہوتا تھا۔ آپ کو خیال آیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی مٹی ہوئی درس گاہ کا زمینِ حرم پر از سرِ نو احیاء کیا جائے۔ جس میں مہاجرین کی اولاد اور عرب بچوں کی تعلیم و تربیت کے انتظام کے ساتھ صنعت و دست کاری سکھانے کے لیے بھی ایک باقاعدہ صنعتی اسکول اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہو تاکہ مدارس سے فارغ شدہ طلبہ گداگری اور افلاس کا شکار ہو کر ننگِ اسلام نہ بنیں۔ مولانا نے اس کے لیے اپیل کی اور کچھ ابتدائی رقم بھی جمع ہو گئی۔

**صولت النساء بیگم**

۱۲۹۰ھ میں کلکتہ کی ایک مخیر خاتون صولت النساء بیگم صاحبہ اپنی لڑکی اور داماد کے ساتھ حج کے لیے آئیں۔ محترمہ نے مکہ معظمہ میں ایک رباط (مسافر خانہ) بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ موصوفہ کے داماد اکثر مسجد حرم میں مولانا کیرانوی کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے مشورہ کے طور پر انہوں نے اپنی خوش دامن کے ارادہ کا ذکر کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں مسافر خانوں کی کمی نہیں۔ سب سے زیادہ ضرورت ایک مدرسہ کی ہے اور مکہ معظمہ میں کوئی مستقل مدرسہ نہیں۔ صولت النساء بیگم صاحبہ دوسرے دن خود حضرت مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس رائے کو پسند کرتے ہوئے مدرسہ کے لیے زمین کی خریدو غیرہ کے متعلق گفتگو کی۔ اللہ تعالیٰ کو یہ عظیم الشان کارِ خیر اس بلند ہمت خاتون سے لینا تھا۔ محلہ خندریسہ میں جگہ خریدی گئی اور مدرسہ کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ اکثر صولت النساء صاحبہ خود تعمیر کا کام دیکھنے کے لیے تشریف لاتیں اور یہ خدمت جس کی محترمہ کو توفیق ہوئی تھی، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتیں۔ یہ سعادت اور فخر اس بیوہ خاتون کے حصہ میں تھا، اس لیے حضرت مولانا رحمۃ اللہ نے ان کے اس ایثار کی یادگار کے طور پر مرکز اسلام کے اس اولین علمی بنا کا نام مدرسہ صولتیہ رکھا، جو قیامت تک ان کے نام کو عزت اور سچی ناموری کے ساتھ زندہ رکھے گا۔

**مدرسہ صولتیہ کا مسلک**

بانیٔ مدرسہ نے گردو پیش کے تمام حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس مدرسہ کے لیے کچھ ہدایات مرتب فرمائیں۔ ان میں بالخصوص ان تین امور کی زیادہ تاکید کی گئی ہے:۔

۱۔ قطعی طور پر سیاسیات اور سیاسی دلچسپیوں سے ہر کارکن و مدرس اور طالب علم کا بے تعلق رہنا ضروری ہے۔

۲۔ اختلافی امور اور مختلف فیہ مسائل سے کلی طور پر احتراز کیا جائے۔

۳۔ تفرق اور گروہ بندی سے ہر طرح بچنا چاہیئے۔

مولانا نے ان تینوں امور کو مدرسہ کا گویا مستقل مسلک قرار دیا۔ اس مدرسہ کے ابتدائی دور میں مولانا کیرانوی سے جن اصحاب کو شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ ان میں سے چند نام درج ذیل ہیں:۔

۱۔ شریف حسین بن علی۔ سابق امیر مکہ (بانی حکومت ہاشمیہ) ۲۔ شیخ احمد عبداللہ مرداد۔ شیخ الائمۃ والخطبا

(۳) شیخ عبدالرحمٰن سراج مفتی احناف و شیخ العلماء مکہ معظمہ (۴) امین محمد مرداد نائب قاضی مکہ مکرمہ (۵) عبدالرحمٰن احمد دہان صدر مدرس مدرسہ صولتیہ (۶) عبدالستار دہلوی (۷) سید حسن وحلاں وغیرھم۔

اگر دارالعلوم حرم صولتیہ کے ابنائے قدیم کی فہرست دیکھی جائے تو مرحومین کو چھوڑ کر حال کے جو علماء "اعلم حجاز" کہلاتے ہیں جیسے شیخ یحییٰ امان، شیخ حسن مشاط وغیرہ۔ سب مدرسہ صولتیہ کے فیض یافتہ ہیں۔

مکہ مکرمہ کا تیسرا مدرسہ دارالحدیث خیریہ ہے، اس مدرسہ کی زیارت کا بھی موقع ملا۔ حضرت مولانا علی محمد صاحب کا کے پوتا جو سندھ کے مشاہیر علماء میں سے ہیں اور پروفیسر فخرالحسن کی معیت میں دارالحدیث خیریہ میں پہنچا۔ اس مدرسہ کے مدیر اعلیٰ شیخ حمزہ عبدالرزاق محدث ہیں۔ شیخ حمزہ سے غائبانہ تعارف تو تھا کیونکہ وہ میرے استاذ علامہ عبیداللہ سندھی کے شاگرد اور میرے دوست مولانا محمد نور مرشد مکی کے استاذ ہیں۔ شیخ حمزہ اصل میں مصری عالم ہیں لیکن ہجرت کر کے مکہ میں مقیم ہو گئے۔ آپ کی کتب بینی اور مطالعہ کے شوق کی تعریف تو میں نے پہلے سے سن رکھی تھی۔ ان کی یہی چیز میرے لیے خاص طور سے جاذب نظر تھی، کیونکہ مجھے بھی ایسی ہی دھن رہتی ہے شیخ حمزہ سے جب ملاقات ہوئی تو سنی ہوئی خبروں سے ان کو زیادہ پایا۔ کتابوں کے ڈھیر ان کے اردگرد تھے، اور وہ مطالعہ میں مصروف تھے۔ اس وقت ان کی عمر ستر کے قریب ہو گی لیکن پھر بھی مطالعہ جاری ہے۔ میں نے ان کی خدمت میں دو کتابیں تفسیر الہام الرحمٰن تالیف علامہ سندھی اور لمحات تالیف شاہ ولی اللہؒ پیش کیں۔ بڑے خوش ہوئے اور مجھے بھی اپنی کچھ کتابیں عنایت فرمائیں۔

اس مدرسہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اساتذہ سب کے سب سلفیہ مشرب کے ہیں، مولانا عبدالحق صاحب بہاولپوری جن کو وہاں سندھی کہا جاتا ہے، اسی مدرسہ میں حدیث کا درس دیتے ہیں، آپ میرے پرانے کرم فرما ہیں۔ ان سے بھی علمی مجلسیں ہوتی رہیں، اسی طرح ایک دوسرے عالم مولانا عبداللہ صاحب لکھنوی بھی اسی مدرسہ کے شیخ الحدیث ہیں۔ مولانا محمد عبداللہ صاحب، کے حسن اخلاق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، ہماری بڑی خاطر تواضع فرمائی، کتب خانہ کا بھی معائنہ کرایا۔ جزاہ اللہ خیراً۔

اسی مدرسہ میں ایک روز علماء کا بہت بڑا اجتماع ہوا۔ اس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا، جامعہ مدنیہ کے کچھ اساتذہ بھی موجود تھے۔ مکہ مکرمہ کے بڑے بڑے علماء کے علاوہ ہندوستان سے مولانا عبیداللہ الرحمٰن صاحب

شارح مشکوٰۃ اعظم گڈھی اور دوسرے علماء موجود تھے۔ تقریریں شروع ہوئیں، موضوع تھا "التمسک بالکتاب والسنۃ" شروع میں شیخ حمزہ عبدالرزاق نے ایک مفصل تقریر فرمائی، اس کے بعد جامعہ مدنیہ کے اساتذہ نے خطاب فرمایا۔ پھر ہندوستان اور پاکستان کے علماء کی باری آئی۔ دوسرے حضرات نے تو اردو میں خطاب فرمایا لیکن راقم مدرسہ کی طرف سے مجھے حکم ملا کہ میں عربی میں خطاب کروں۔ ظاہر ہے کہ میرا ان دیار کا یہ سفر پہلا تھا اور عرب علماء کی تو عربی مادری زبان تھی۔ ان کے سامنے بغیر کسی تیاری کے ایک مشکل موضوع پر اظہار خیال کرنا بڑی مشکل بات تھی۔ لیکن اللہ پاک کی اعانت شامل حال رہی۔ برابر پونا گھنٹہ اس موضوع پر میں عربی زبان میں بولتا رہا۔ اس سلسلے میں مجھے سندھ کے قدیم علماء کو متعارف کرانے کا بھی موقع مل گیا۔ چنانچہ منصورہ سے لے کر ٹھٹہ تک درس و تدریس کے سلسلوں اور ان کے ممتاز اہل علم کا سرسری ذکر کر دیا۔ عرب علماء یہاں کی دینی خدمات سے بڑے متاثر ہوئے۔

## زیارتِ آثار

ایک روز مکہ مکرمہ کے تاریخی آثار دیکھنے کا پروگرام بنا۔ صفا کے قریب ہم ایک ٹیکسی میں سوار ہوئے۔ اس کا ڈرائیور ایک بخاری النسل نوجوان عرب تھا۔ اس سے طے یہ پایا کہ مکہ مکرمہ سے عرفات تک جتنے بھی آثار مقدسہ ہیں وہ دیکھ کر واپس آئیں گے۔ ابھی ہم صفا کے قریب ہی تھے کہ بخاری نوجوان نے ایک نئی تعمیر کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ "دارِ ارقم" ہے جس کا ایک حصہ سڑک کی نذر ہو چکا ہے اور دوسرا حصہ دکانوں میں شامل ہو گیا ہے۔

دارِ ارقم کی بہت بڑی تاریخی حیثیت ہے، یہ وہ جگہ تھی جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے شر پسند لوگوں کی ایذا رسانی سے نجات مل جاتی تھی۔ آنحضرت صلعم اس مکان میں عبادت بھی کیا کرتے تھے یہیں آپ کے اپنے جاں نثار ساتھیوں سے مشورے ہوتے اور آپ ان کو اسلام کی تعلیم بھی دیا کرتے۔ اسی جگہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضورؐ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے۔

صفا سے آگے بڑھے تو مکہ کے تاریخی پہاڑ ابو قبیس کا سلسلہ شروع ہوا۔ مکہ مکرمہ ہر طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے شمال مغرب میں جبل فلج، جبل ہندی (غالباً شیخ علی متقی ہندی کی رہائش کی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا ہے) جبل قیقعان وغیرہ ہیں۔ اور جنوب مشرق میں جبل ابی حدیدہ، جبل ابو قبیس اور جبل خندمہ وغیرہ ہیں۔ لیکن ان سب پہاڑوں میں جبل ابو قبیس زیادہ مشہور ہے۔ یہ پہاڑ فاران کے نام سے بھی موسوم تھا کہتے ہیں

کہ یہ وہی مبارک پہاڑ ہے جس پر چڑھ کر فتح مکہ کے بعد حضرت بلال رضؓ نے اذان دی تھی۔ اس کی یاد میں اس پہاڑ کی چوٹی پر مسجد بلال بنی ہوئی ہے جو حرم سے اچھی طرح نظر آتی ہے، اسی جبل ابوقبیس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شق القمر کا معجزہ صادر ہوا تھا۔ اس پر جانے کے لیے اس لیے ضرورت پیش نہ آئی کہ صفا کے بازار میں روزانہ آنا جانا ہوتا تھا اور اس بازار سے سیڑھیاں چڑھ کر اس پہاڑ پر پہنچتے تھے۔ لہٰذا اس کی روزانہ سیر ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی ہم رات کو اچھی چائے کی تلاش میں بھی جبل ابوقبیس پر چلے جاتے تھے۔ حرم شریف اسی پہاڑ کے دامن میں واقع ہے، اگر حرم شریف میں نماز ہو رہی ہو تو مسجد بلال سے صاف دکھائی دیتی ہے۔ نبی صلعم کے خاندان کے لوگ بنو ہاشم جبل ابوقبیس کی طرف آباد تھے۔ اس سے کچھ آگے بڑھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت نظر آئی، جس کو ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے، کچھ اور آگے بڑھے تو دو مسجدیں نظر آئیں ایک چھوٹی تھی جس کو مسجد الرایہ کہا جاتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ یہ مسجد اس جگہ واقع ہے جہاں فتح مکہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جھنڈا نصب کیا۔ "رایت" عربی میں جھنڈے کو کہتے ہیں۔ دوسری مسجد الجن کہلاتی ہے۔ اس جگہ جنوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔

اس سے کچھ اور آگے بڑھے تو حجون نامی پہاڑ نظر آیا، جہاں مکہ معظمہ کا تاریخی قبرستان المعلاۃ واقع ہے۔ یہ قبرستان منیٰ کے راستے میں بائیں ہاتھ کو پڑتا ہے۔ اس قبرستان میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ، حضرت اسماء رضؓ بنت ابوبکر صدیق رضؓ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضؓ اور دوسرے اکابر کے مزارات ہیں، لیکن تمام قبروں کو مسمار کر دیا گیا ہے۔ حجون اور ایک دوسرے پہاڑ کے درمیان سے شمال مغرب کو ایک سڑک جاتی ہے جس پر ایک تختی لگی ہوئی تھی اس پر "کدا" لکھا ہوا تھا، کہتے ہیں کہ یہ وہی راستہ ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے تھے۔ یہ راستہ منیٰ جانے کے لیے جنوب مشرق کی طرف مڑ جاتا ہے، موڑ سے قریب کوہ حرا یا جبل نور دکھائی دیا، جو کہ حرم سے غالباً تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

کوہ حرا کی چوٹی پر ایک گنبد ہے، چوٹی سے بیس پچیس فٹ نیچے ایک غار ہے جو کہ غار حرا کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام بعثت سے قبل اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے یہیں روح الامین حضرت جبرائیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لیے پیغام لائے۔ غار مسطح ہے اور قدِ آدم

بلند ہے اور مشرق و مغرب دونوں طرف سے کھلا ہوا ہے۔ اس لیے روشنی اور ہوا بلا روک آتی رہتی ہے۔ کوہ حرا کے مشرق میں عرفات اور طائف کے پہاڑ ہیں۔ ہمارا ارادہ کوہ حرا پر چڑھنے اور غار حرا کو اندر سے دیکھنے کا تھا، لیکن ہمارے معلّم محمد ہاشم صاحب سندھی نے ہمیں ایک سال پہلے کا واقعہ سنا کر ڈرا دیا تھا کہ ایک شخص اوپر گیا اور شدتِ پیاس کی وجہ سے وہیں مرگیا اور اس کی نعش کو نیچے اتارنے میں تین سو ریال خرچ ہوئے تھے۔

منیٰ وہاں سے قریب تھا چونکہ یہ مقام حج کے موقع پر ہی آباد ہوتا ہے اس لیے قبل از حج آدمی کم اور عمارتیں زیادہ نظر آئیں۔ منیٰ کے وسط میں مسجد الخیف کے پاس ہم موٹر سے اترے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں قیام فرمایا تھا اور صحابہ کے ساتھ پانچ نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ تینوں جمروں کو بھی دیکھا جہاں تین دن تک کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ ڈرائیور نے ایک چھوٹی مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ بعیتِ عقبۂ اولیٰ اسی جگہ ہوئی تھی۔

منیٰ کے بعد وادی محسر آئی۔ جہاں اصحاب الفیل "طیراً ابابیل" کی کنکریوں سے ختم ہوئے تھے چونکہ یہ وادی عذاب کی جگہ ہے اس لیے احکامِ حج میں ہے کہ اس وادی کو جلد پار کیا جائے۔ وادیٔ محسر کو پار کرکے ہم مزدلفہ پہنچے اور وہاں مسجد میں نفل ادا کیے۔ پھر آگے عرفات کی طرف بڑھے اس کی مسجد النمرہ میں نفل پڑھے پھر جبل الرحمت کے اوپر چڑھے اس پر ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی جس کے متعلق روایت ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قریب صحابۂ کرام سے خطاب فرمایا تھا۔ اس مسجد میں ہم نے نماز ادا کی اور پھر تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر مکہ مکرمہ واپس لوٹ آئے۔

**طائف کو روانگی**

حجاج کو حجاز کے کسی شہر میں جانے کے لیے حکومت سے پروانۂ اجازت حاصل کرنا پڑتا ہے طائف کے متعلق سیرت کی کتابوں میں بہت کچھ پڑھ چکے تھے۔ اس لیے اس کی زیارت کا خاص اشتیاق تھا۔ اپنے معلّم محمد ہاشم صاحب سندھی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے ہم تینوں ساتھیوں کے لیے حکومت سے اجازت حاصل کرلی۔ سندھ کے ایک عالم مولانا علی محمد صاحب کا کیپٹن تا دجو کہ اس سال حج کے لیے تشریف لائے تھے، سے بھی ہم نے ساتھ چلنے کو کہا۔ مولانا موصوف کو بڑی جدوجہد کے بعد بھی اجازت نہ مل سکی۔ مجبوراً ہم تینوں رفقاء ——— پروفیسر ظہور احمد، پروفیسر سید فخر الحسن اور میں عازمِ طائف ہوئے۔ طائف کا

بس اسٹاپ "المعلاۃ" کے قریب ہے وہاں پاسیوں ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سیٹوں کے ریٹ مقرر ہیں۔ ہم دو ریال دیتے ہیں بیٹھے اور فی آدمی مکہ سے طائف تک پانچ ریال کرایہ ادا کرنا پڑا۔ فرسٹ کے سات ریال اور آخری ویسے کے تین ریال تھے۔

طائف مکہ مکرمہ سے ۱۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، راستہ بے حد خراب تھا، چار گھنٹے میں ہم طائف پہنچ گئے۔ لیکن ایک تو راستہ خراب اور دوسرے ڈرائیور اتنی تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا رہا کہ ہمارے سر موٹر کی چھت سے بری طرح ٹکراتے تھے۔ اپریل کی آخری تاریخیں تھیں مکہ معظمہ میں کافی گرمی تھی لیکن ہم جب طائف پہنچے تو ہوا میں خنکی تھی اور ہمیں سردی محسوس ہونے لگی۔ راستے میں کئی منزلیں آئیں قرن المنازل سے احرام باندھے جاتے ہیں۔ یہ اہلِ نجد کے لیے میقات ہے۔ آگے ایک وادی سے گزرے جہاں کھجوروں کے چھوٹے چھوٹے درخت دکھائی دیے۔ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے عربوں نے بتایا کہ یہ وہ وادی ہے جہاں زمانۂ جاہلیت میں عکاظ، ذی المجاز اور مجنہ کے میلے لگتے تھے۔ طائف کے قریب ایک ہوائی اڈہ نظر آیا ہوائی اڈے سے طائف تک پکا راستہ ہے۔

طائف پہنچتے ہی ہم مسجد ابن عباس میں نماز ظہر پڑھنے گئے۔ وہاں ہم نے نماز با جماعت ادا کی مسجد کے بائیں طرف ایک حجرے میں، جو متصل تھا، حضرت ابن عباسؓ کی قبر ہے۔ اسی بنا پر اس کا نام مسجد ابن عباسؓ ہے۔ مسجد کے دو حصے ہیں، ایک پرانا دوسرا نیا۔ نیا حصہ کافی وسیع اور عالیشان ہے۔ ہم نے یہاں سے حضرت ابن عباسؓ کی قبر حجرے کے دروازے کے سوراخوں میں سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن نمازیوں اور مسجد کے محافظوں نے ہمیں سختی سے روکا۔ بہرحال اندر جھانکنے سے اتنا معلوم ہوا کہ قبر کافی خستہ ہے۔ زیر مرمت نہ ہونے کی وجہ سے حجرے کی حالت بھی خراب ہے۔

جیسے ہی ہم مسجد ابن عباسؓ سے نماز پڑھ کر باہر نکلے، زور کی بارش شروع ہو گئی۔ بارش سے بچنے کے لیے ہم نے شارع ابن عباسؓ پر پھلوں کی ایک دکان میں پناہ لی۔ دکان میں ساتھ ساتھ تھیں ہم نے ان سے کشمش اور چلغوزے خریدے۔ دکان دار سے جب ہم نے عربی میں بات چیت کی تو وہ سندھی نکلا۔ گو وہ سندھی زبان نہیں جانتا تھا لیکن ہمیں پاکستانی سمجھ کر کہنے لگا کہ ہمارے آباؤ اجداد سندھ سے آئے تھے اور مکہ میں مقیم ہو گئے۔ ان کو وہاں بوقری کہا جاتا ہے۔ اصل میں یہ بوگڑی تھے۔ عربی میں بوقری ہو گئے۔ ان کی گفتگو میں بھی [illegible]

ہیں۔ قدیم وطن کے لوگوں سے اچھی طرح پیش آتے ہیں لیکن سندھی زبان سے بالکل نابلد ہیں، دوسری طرف ہم نے دیکھا کہ بنگالی مہاجر مکہ میں صدیوں سے مقیم ہیں، لیکن ان کا دستور یہ ہے کہ گھر میں بچوں سے بنگالی زبان میں بات چیت کرتے ہیں اور باہر عربی بولتے ہیں، اس طرح اپنے وطن سے باہر رہ کر بھی انھوں نے اپنی زبان محفوظ رکھی ہے۔

بارش کی وجہ سے کچھ یمنی لوگ بھی اسی دکان پہ آ پہنچے - ان سب کی کمر میں خنجر آویزاں تھے اور یہ فوجی معلوم ہوتے تھے - کوئی آٹھ دس نوجوان ہوں گے - وہ بارش میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر جمال عبدالناصر اور جنرل سلال کو برا بھلا کہتے اور امام بدر اور شاہ سعود کی فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے - ہم نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک یمنی نوجوان سے کہا کہ آخر ناصر بھی تمہاری طرح مسلمان ہے تم اس پر لعن طعن کیوں کر رہے ہو - اس نے نہایت دھیمی آواز میں مجھ سے کہا کہ ہم ظاہر میں بد دعائیں دیتے ہیں - کیوں کہ ہم شاہ کا کھاتے ہیں، باقی فی الحقیقت ہم ناصر یا سلال کے خلاف نہیں ہیں۔

مسجد ابن عباس رضؓ کے قریب شاہراہ پر پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بنو ثقیف کے بت لات کا ٹکڑا ہے - مسجد ابن عباس کے محل وقوع کے متعلق سنا گیا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں طائف کے محاصرہ کے وقت مسلمانوں کے لشکر کا قیام تھا - اس کے قریب ہی شہداء صحابہ کی قبریں بھی بتائی جاتی ہیں۔

واپسی میں ہم نے فی آدمی ۲ ریال کرایہ دیا، جب کہ آتے وقت پانچ ریال فی کس دینا پڑا تھا - راستے میں ذات عرق میں مغرب کی نماز ادا کی اور عمرہ کا احرام باندھا - رات کو مکہ معظمہ میں داخل ہوئے، صبح کو احکام عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام سے فراغت پائی۔

## حج کی ادائیگی

حج کے ایام قریب آ گئے تھے اور مکہ معظمہ میں جتنے حجاج کو آنا تھا وہ سب پہنچ گئے تھے۔ اس سال ہزاروں کی تعداد میں ترک خشکی کے راستے اپنی مخصوص گاڑیوں پر حج کرنے کے لیے آئے تھے - سالہا سال کی بندش کے بعد ان کو اجازت ملی تھی، اس سبب سے ان میں بڑا ذوق و اشتیاق تھا، چونکہ مصری اور سعودی حکومتوں کی باہمی پرخاش کی وجہ سے مصر سے حجاج نہیں آئے تھے لیکن اس کی تلافی ترک حجاج نے کر دی - الجزائر سے بھی کافی لوگ آئے تھے جو نہایت تنومند اور قوی معلوم ہوتے تھے - ان ایام میں حجر اسود کا بوسہ دینا ہر کسی کا کام نہ تھا کیوں کہ بڑا اژدحام رہتا تھا - شروع میں تو پنجاب کے لوگ دوسروں کو دھکیلتے ہوئے حجر اسود

تک پہنچ جاتے تھے لیکن افریقہ کے کالے رنگ کے قوی لوگوں کی آمد کے بعد پنجاب والوں پر بازی لے گئے اور جب الجزائر اور شام کے علاوہ حلب کے حجاج پہنچے تو یہ سب سے بازی لے گئے۔ ان دنوں مطاف میں طواف کرنے والوں کا اتنا اژدحام ہوتا (خاص طور پر مقام ابراہیم کے قریب) کہ گذرنا محال ہوتا تھا۔ نماز کے لیے بھی اگر حرم میں ایک گھنٹہ پہلے آتے تھے تو جگہ مل جاتی تھی ورنہ پھر حرم کے دروازہ پر یا باہر کھڑا ہونا پڑتا تھا نماز میں صفیں ایک دوسرے سے اتنی قریب ہوتی تھیں کہ سجدہ کے لیے بے حد سکڑنا پڑتا تھا۔

۱۳ مئی بروز جمعہ کے لیے حج کے دن کا اعلان کیا گیا۔ اور یہ اعلان ماہ ذی الحجّہ کی ۶، ۷ تاریخ کو ہوا اور یہ اس لیے کہ حج کے لیے چاند کی تاریخوں کا فیصلہ ریاض کے علماء کرتے ہیں اور پھر اس کی تصدیق شاہ کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اس کے بعد حج کی تاریخوں کا اعلان کیا جاتا ہے۔ ۸ تاریخ کی صبح کو ہم نے حج کے لیے احرام باندھا اور منیٰ جانے کے لیے تیاری کی، پہلے تو میرا منیٰ تک پیدل جانے کا ارادہ تھا لیکن محمد ہاشم صاحب معلّم نے اس سے روکا اور کہا کہ اس موقع پر بڑا اژدحام ہوتا ہے۔ معلم صاحب کی طرف سے بس کا انتظام تھا، تھوڑی دیر میں ہم منیٰ پہنچ گئے معلموں کی طرف سے وہاں پہلے ہی خیموں کا انتظام تھا، ہمارے خیمے مسجد الخیف کے بالکل قریب تھے، ایک رات منیٰ میں ٹھہرنا پڑا، شام کو سفیر پاکستان متعین سعودی عرب جناب عبدالفتاح میمن پاکستانی حجاج سے ملنے آئے وہ ہر ایک حاجی سے نہایت خندہ پیشانی اور محبّت سے مصافحہ کرتے اور اس کی خیر خیریت معلوم کرتے تھے۔ میرے لیے تو موصوف اجنبی نہ تھے اور پھر لطف یہ کہ ان کے مشیر خصوصی مولوی قاری خیر محمد صاحب سے میرے پرانے مراسم تھے۔ رات کو قاری خیر محمد صاحب کی معیت میں نواب نبی بخش خاں بھٹو اور ان کے صاحب زادے معشوق علی صاحب سے ملنے گیا، موصوف سندھ کی ایک عظیم شخصیت اور بڑے مرنجاں مرنج بزرگ ہیں، ان کی علم پروری کا یہ عالم ہے کہ سندھ کے اکثر عربی مدارس کو ان کی طرف سے گرانٹ ملتی رہتی ہے۔ خود ان کے شہر میں عربی تعلیم کا بہت بڑا مدرسہ ہے جو ان کے خرچ پر چل رہا ہے۔ اسی مدرسہ میں استاذ العلماء العلامہ الحاج عبدالکریم الکورائی درس دیتے رہے۔ علامہ کورائی کو دیکھ کر سندھ کے قدیم علمائے ٹھٹھہ اور دوسرے محققین یاد آجاتے تھے۔ میرے وہ خصوصی استاذ تھے۔ میں نے گیارہ بارہ برس مسلسل ان کے ہاں علمی تربیت پائی اور پھر ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق اسی مدرسہ میں تین برس صدر مدرس کی حیثیت میں رہا۔ حضرت استاذ العلام

کے صاحب زادے مولانا عبدالغفار صاحب نے مجھ سے پڑھا تھا۔ پندرہ برس کے بعد نواب صاحب سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ ویسے تو بڑے لوگوں سے ملنے سے اکثر اجتناب کرتا ہوں، لیکن نواب صاحب کی حیثیت دوسری ہے، وہ نہایت ہی متواضع اور اعلیٰ کردار کے مالک ہیں۔ موصوف کی رہائش سفیرِ پاکستان جناب میمن صاحب کے ہاں تھی، اس طرح مجھے میمن صاحب سے دوبارہ ملنے کا موقع مل گیا۔

**عرفات کو روانگی**

۸ ذی الحج مطابق ۳ مئی ۱۹۶۳ء کو صبح کی نماز پڑھ کر ہم بس میں عرفات کو روانہ ہوئے گاڑیوں کا اتنا اژدحام تھا کہ الامان والحفیظ، میدانی علاقہ تھا جس کا جس طرح جی چاہتا تھا، اپنی گاڑی کو دوڑا کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ لبیک لبیک کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں اور اس کے ساتھ گاڑیوں کے ہارن بھی بجتے جاتے تھے، پیدل جانے والی جماعتیں بھی بسوں اور موٹروں کے ساتھ ساتھ گرد و غبار میں چل رہی تھیں، بسوں کی رفتار کہیں تو پیدل چلنے والوں سے بھی کم تھی۔ دنیا اس طرح مار دھاڑ کرتی جارہی تھی کہ ہر دم ایکسیڈنٹ کا خطرہ تھا۔ بہرحال ہم عرفات پہنچ گئے۔

حسبِ دستور ظہر اور عصر کی نماز ہم نے عرفات میں پڑھی اور مغرب تک کھڑے کھڑے دعا و مناجات کرتے رہے۔ وہاں عام حاجیوں کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہ خیموں میں کھانے پینے میں مصروف رہتے ہیں اور جب عصر کی نماز کا وقت ہوا تو معلم صاحبان کی معیت میں دعائیں پڑھنے لگے اور اسی کو ہی وہ حج تصور کرتے ہیں غرض جیسے ہی سورج غروب ہوا مزدلفہ کی طرف روانگی شروع ہوئی۔ واپسی میں تو اور بھی زیادہ خطرہ محسوس ہوتا تھا، کیوں کہ ایک تو اندھیرا تھا اور دوسرے گاڑیاں بُری طرح غبار اڑا رہی تھیں۔ راستے میں کچھ لوگ بیچارے پیدل چلنے والے جو اُن کی زد میں آگئے تھے، وہ مرے ہوئے راستے پر پڑے تھے۔ مغرب اور عشاء کی نماز حسبِ دستور مزدلفہ میں ملا کر پڑھی۔ صبح ہوئی تو اندھیرے میں صبح کی نماز ادا کی اور پھر منیٰ روانہ ہوگئے۔ منیٰ پہنچ کر جمرۃ العقبہ میں رمی کیا اور پھر قربانی کی تلاش میں تینوں رفقاء نکل پڑے۔

قربانی کے لیے بکروں اور دنبوں کی بڑی فراوانی تھی، یہ بکرے اور دنبے نہ صرف حجاز سے بلکہ دور دراز ملکوں سے بھی لائے جاتے ہیں۔ ایک اچھا بکرا عام طور پر چالیس پچاس ریال میں مل جاتا ہے۔ ہمارے کچھ اور بھی ساتھی تھے جنہیں قربانی کرنا تھی چنانچہ پروفیسر ظہور احمد کی تجویز پر ہم نے مکہ مکرمہ سے ایک تیز چھُرا خرید لیا تھا تاکہ خود

اپنے ہاتھ سے قربانی کریں۔ اور اس طرح سنتِ ابراہیمیؑ کی ادائیگی ہو۔ اسی روز یعنی ۱۰ تاریخ کو ہم تینوں — پروفیسر سید فخرالحسن، پروفیسر ظہور احمد اور میں — ایک روپیہ فی آدمی کرایہ دے کر مکہ مکرمہ طوافِ زیارت کے لیے گئے۔ یہ طواف جملہ طوافوں سے اہم ہے کیونکہ اس کے چھوٹنے سے حج ادا نہیں ہوتا اور یہ طواف حج کے لیے رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔ رات کو پھر منیٰ لوٹے کیونکہ ۱۱ اور ۱۲ کو رمی جمرات کرنا تھا اور یہ عرصہ منیٰ میں ہی گزارنا پڑتا ہے۔ رمی جمرات کے موقعہ پر اژدحام اتنا تھا کہ جان کا خطرہ تھا، اگر کوئی گر جاتا تو پیچھے آنے والے لوگ اس کی چیخ پکار کی پروا کیے بغیر اس کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ اور عورتوں اور بچوں کا خیال تک نہ کیا جاتا۔ حکومت بھی اس کے انتظام سے قاصر ہے۔ منیٰ کے دورانِ قیام میں ایک اور چیز جس کو سب زائرین محسوس کر رہے تھے یہ تھی کہ قربانی کے لاکھوں بکرے دنبے اور اونٹ ذبح کرنے کی وجہ سے وہاں بڑی بدبو پھیلتی ہے اور گوشت سڑتا رہتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر گوشت سکھانے کا کوئی کارخانہ ہو اور کھالوں کی بھی حفاظت کی جائے۔

بارھویں ذی الحج کو تینوں جمروں کا رمی کرنے کے بعد مکہ معظمہ ہم واپس آ گئے اور اس طرح بحمداللہ حج کے جملہ ارکان سے فراغت حاصل ہوئی۔ اب جب تک مدینہ منورہ کی طرف جانے کی اجازت نہ ملتی ہمیں مکہ معظمہ میں ہی قیام کرنا تھا۔ اس دوران حرم کی حاضری، طوافِ کعبہ کے علاوہ علماء کی مجالس میں شرکت، حرم کے مدرسین سے ملاقاتیں، اور علمائے سندھ کی تالیفات کی تلاش — یہ میری مصروفیات تھیں۔ مدرسہ صولتیہ کے ناظم مولانا حافظ محمد سلیم صاحب سے مدرسہ کے کتب خانہ کی زیارت کے لیے میں نے پہلے ہی استدعا کی تھی۔ انہوں نے فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد لائبریری دکھانے کا وعدہ کیا تھا کیونکہ ایامِ حج میں مدرسہ کے دفتر میں زائرین کا بڑا ہجوم رہتا ہے، حجاج اپنی امانتیں بھی ناظم صاحب کے ہاں رکھتے ہیں اور ہزاروں ریالوں کا حساب کتاب ان کو حسبۃً للہ رکھنا پڑتا ہے۔ مدرسہ کا یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے جس کو موجودہ ناظم صاحب قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ایک روز ناظم صاحب نے مجھ کو کھانے پر بلایا اور کھانے سے پہلے کتب خانہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ ناظمِ مدرسہ کے صاحب زادے نہایت با اخلاق عالم ہیں۔ ان کی معیت میں کتب خانہ کی زیارت کی۔ لائبریری وسیع جگہ میں ہے۔ کتابیں بے شمار ہیں اور بڑے سلیقہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ ایامِ حج کی وجہ سے کتب خانہ بند تھا ورنہ عام طور سے شائقینِ علم کے مطالعہ کے لیے کھلا رہتا ہے۔ علماء سندھ کی کتابیں تو مجھے یہاں دستیاب نہ ہوئیں۔

لیکن دوسری کئی نادر کتابیں دیکھنے میں آئیں۔

کتب خانہ کا ایک حصہ الگ نظر آیا۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ یہ سب کتابیں حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی ہیں جو آپ نے مدرسہ کے لیے وقف فرمائی تھیں، پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ مدرسہ صولتیہ کے بانی مولانا رحمت اللہ صاحبؒ مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ کے پہنچنے کے ایک یا دو ہفتے بعد آ گئے تھے اور دونوں کی بود و باش ایک ساتھ تھی۔ مولانا اسلم صاحب نے بتایا کہ نواب چھتاری نے مکہ میں ایک لونڈی خرید کر کے اسے آزاد کیا اور پھر حضرت حاجی صاحب کی خدمت کے لیے اس کو پیش کیا۔ حاجی صاحب نے اس کی اپنے ایک خادم عبدالرحیم نامی سے شادی کرا دی۔ یہ عبدالرحیم اصل میں اچھوت اور دیوبند کے رہنے والے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے۔ جس پر وہاں کے ہندوؤں نے ہنگامہ برپا کیا۔ اس لیے مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس کو مکہ معظمہ میں حاجی امداد اللہ کی طرف بھیج دیا۔ حضرت حاجی صاحب کے دو اور خادم تھے ایک شیخ شفیع الدین اور دوسرے شیخ محب اللہ، جن کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہے کہ یہ دونوں حاجی صاحب کے خلفاء تھے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اصل میں یہ دونوں آپ کے خادم تھے۔ جب حاجی امداد اللہ صاحب کی موت قریب آ گئی تو آپ کے معتقدین نے آپ سے عرض کیا کہ اپنے خلفاء میں سے کسی کو اپنی مسند پر بٹھائیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں ایک فقیر آدمی ہوں اور میں مسند نشینی کو دوست نہیں رکھتا، اگر میرے خلفاء میں سے کسی میں اہلیت ہو گی تو وہ خود بخود دین کی خدمت کرتا رہے گا۔ خواہ وہ کہیں بھی ہو گا۔ آپ نے اپنی جملہ کتابیں مدرسہ صولتیہ کے لیے وقف فرمائیں۔ کتب خانے میں ذیل کی خطی کتابیں نظر سے گزریں:۔

۱۔ ایضاح شرح مفصل ـــ اوراق ۱۹۵ سن کتابت ۷۶۴ھ۔ اس کا خط متوسط تھا۔ یہ نحو کی مشہور اور نادر کتاب ہے۔

۲۔ التصریح شرح التوضیح شرح الالفیہ لشیخ خالد بن عبداللہ الازھری والتوضیح لشیخ جمال الدین بن محمد۔ اس کا خط عمدہ تھا۔ جزء اول۔ ضخیم۔ کتابت ۱۰۵۹ھ۔

۳۔ حواشی عبدالحکیم سیالکوٹی علیٰ حاشیۃ عبدالغفور۔ یہ بھی مشہور حواشی ہیں جو یہاں مطبوعہ ہیں۔ لیکن یہ قلمی نسخہ

صحیح معلوم ہوا۔

۴۔ تفسیر الصادقی (عربی) تالیف شیخ محمد اغلشی نقشبندی۔ مؤلف کے ہاتھ سے لکھی ہوئی سورۂ مریم سے آخر تک۔ سن کتابت: ۹۹۲ھ۔

۵۔ لطائف التفسیر کامل فارسی از کتب خانۂ فیوض امدادیہ۔

۶۔ حاشیۃ العصام علی تفسیر البیضاوی دو نسخہ۔ ایک نسخہ ناقص تھا۔ یہ کتاب نوادر زمانہ میں سے ہے اور فاضل عصام الدین کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو آج تک طبع نہیں ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ سندھ کے ایک گوٹھ پیر بخش بھٹو میں مولوی عبدالحکیم صاحبؒ کی ذاتی لائبریری میں تھا جس کا میں نے بالاستیفاء مطالعہ کیا تھا۔ یہ نسخہ حضرت استاذ علامہ کورائیؒ کے زیر مطالعہ بھی رہا۔ اور آپ نے تفسیر بیضاوی پر حواشی لکھنے میں ان حواشی عصام سے بڑا استفادہ کیا۔ حضرت استاذ کی یہ تالیف کارخانہ تجارتِ کتب کراچی کی طرف سے چھپ چکی ہے۔

۷۔ رسوخ الاخبار فی منسوخ الاخبار۔ (عربی) جزء واحد۔ تالیف شیخ برہان الدین جعبری۔ سن کتابت ۸۰۳ھ۔

۸۔ مرقاۃ الصعود شرح ابی داؤد۔ تالیف سیوطی۔ جزء واحد۔ یہ نسخہ آخر سے ناقص معلوم ہوتا تھا۔

۹۔ ہیئت کے آلات: اسطرلاب مغربی۔ نہایت قدیم تھا۔ اور پیتل کا بنا ہوا تھا۔ اس کے پانچ صفائح تھے۔ تین ارباع تھے۔ مجیب، مقنطر سب لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ تین عدد کرے تھے۔ جس میں سے ایک سماوی اور دو ارضی تھے۔ ایک بڑا سماوی کی طرح تھا اور دوسرا چھوٹا تھا۔

مجموعی طور پر منطق کی کتابیں کافی تھیں جن کی تعداد دو سو اٹھارہ ہے۔ ہیئت کی ۲۴، ہندسہ کی ۸، کتب تاریخ ۱۱۲، کتب عروض ۸، کتب ادب ۲۲ تھیں اور یہ سب ۴۰۔۱۳۰ تک کی جمع شدہ ہیں، اس کے بعد بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔